ڈاکٹر گل عباس اعوان

ناول ”پلوتا“ کا مابعد جدید مطالعہ

POST MODERN STUDY OF THE NOVEL “PALOTA”

Abstract

The post modernism is a unique philosophy treated in the language and literate of many languages. Along with other languages the scholars and writers of siraiki language is also depicted the post modernism in many and multi dimension. Basically the post modernism is a condition which alose many things cultures a psychological condition, aesphicits and social values to interpret different happenings, a siraiki novel palota different social values are depicted in this research papers we have pride to analyse the same. This article basically focus on the post modern condition treated in the novel palota.

ظفر لشاری نے سرائیکی کا پہلا ناول، نازو، لکھا تو اُس کا مزاج، اُردو کے روایتی ناولوں جیسا تھا۔ کہانی، پلاٹ، کردار، مکالمے اور دیگر لوازمات۔ مگر سلیم شہزاد، اُس عہد کا لکھاری ہے جس میں ادب، نئے نظریات کی نئی سرزمینوں سے متعارف ہو چکا ہے۔ اب، ادب کا نو آبادیاتی مطالعہ، ادب کا جدیدیت اور مابعد جدیدیت نظریات کے تناظر میں مطالعہ ہو رہا ہے۔ وجودیت، انسان دوستی اور دیگر مباحث، ادب کا موضوع بن چکے ہیں۔ ایک اچھا ناول نگار، ادب کے ان تمام مباحث سے واقف ہو چکا ہے۔

ایک وقت تھا کہ فکشن میں، علامت نگاری بڑا موضوع تھا۔ علامت کو حقیقت اُجاگر کرنے کا ایک بڑا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر زمانہ بدلا اور تخلیق کار کو:

> “۔۔۔۔ حقیقت انتہائی پُر سرار اور نقاب اندر نقاب دکھائی دینے لگی۔ ادب حقیقت کو، یا، حقیقت کے کسی ایک پرت کو، روشنی کے دائرے میں لانے کے لئے کوشاں ہے۔ چونکہ اس عمل کے لئے، اِس آزمودہ نسخے (مثلاً حقیقت پسندی یا رومانوی پروازِ تخیل) بُری طرح

ناکام ہو چکے ہیں، لہذا وہ مجبور ہے کہ علامتی رویئے کو بروئے کار لائے۔"(1)

لیکن تخلیق کار، حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اور علامت نگاری سے آگے گزر گیا۔ پھر اُس کا ایک ہی مقصد بن گیا، حقیقت اور حقیقت کا اظہار۔ معنوی عمق یا، معنی کی ترسیل کو اوّلیت حاصل ہوئی۔ تخلیق کاروں نے پُرانی ڈگر ترک کی۔ ناول کے بنیادی عناصر سے گریز کیا۔ ناول میں مختلف کہانی پیش کرنے کی جستجو کے ساتھ ساتھ، عام ڈگر سے ہٹ کر کچھ اور پیش کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ایسے کردار پیش کرنے کا خیال اُبھرا، جو کردار پہلے سے نظر نہ آتے ہوں۔ یہ کردار ایسی صورتحال پیدا کریں جس کا پہلے کبھی سامنانہ ہوا ہو۔ یہ کردار، واقعات کو تسلسل سے آگے بڑھانے کی بجائے، معنوی عمق کا احساس دِلائیں اور تسلسل سے احساس دِلائیں، تو ہم ناول کے ساتھ ساتھ، کسی، حیران کر دینے والی چیز سے متعارف ہوں گے۔ یہ چیزے دیگر، ہو گی۔

جب ناول، چیزے دیگر، بنا، تو سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا، ناول کی شعریت قائم رہی یا نہیں۔ ناول کی شعریت تو، ناول کی جمالیات اور سماجیات ہوتی ہیں۔

> "ناول ایک ایسی صنف ہے جو سماجی اور خارجی قدروں کے بغیر، آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔ اس کے بطن سے باطنی اور انسانی قدروں کو کھنگال کر نکالا جاتا ہے۔ ناول میں سماجی اقدار کے بے حد اہمیت ہوا کرتی ہے۔ اس کو سماجیات کہتے ہیں جو کسی بھی طرح سے شعریات، یا، جمالیات سے الگ چیز نہیں ہے۔"(2)

سرائیکی ناول، پلوتا، اس لئے چیزے دیگر، ہے کہ اس میں ناول کی طرح پلاٹ نہیں۔ اس میں ناول کی شعریات موجود ہے کہ اس میں سماجی اقدار موجود ہیں۔ یہی سماجی اقدار، ناول کو ادبی جمالیات عطا کرتی ہیں۔ اور اس میں موجود معنوی عمق، اسے مابعد جدید ناول بنا دیتا ہے۔

کیا سرائیکی ناول، جدیدیت کے عہد میں داخل ہوئے بغیر ہی، مابعد جدیدیت کے عہد میں آپہنچا ہے؟۔ جی۔ ایسا نہیں ہے۔ سرائیکی ناولوں میں اور خصوصاً ناول، پلوتا، میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے عناصر موجود ہیں۔ گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے کہ ادبی قدر، قدرِ محض نہیں ہوتی۔ یہ معنی کی حامل ہوتی ہے اور اس معنی کا سرچشمہ، زندگی اور سماج کا تجربہ اور اس کے مسائل ہیں۔ ناول، پلوتا، میں معنی کا سرچشمہ ایک بستی، اور اس بستی میں موجود ایک درخت، "پنج ہزاری" ہے۔ جس کے گرد یہاں کا پورا سماج اور اس سماج کے مسائل گھوم رہے ہیں۔ ناول میں سرائیکی وسیب کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کو ادبی رنگ دے کر ایک بڑی تھیوری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ علامتی انداز میں بتایا گیا ہے کہ، پلوتا، کیا ہوتا ہے۔ اس کے سماج پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ناول میں موجود لفظ، پلوتا، نے کئی نسلوں کو اپنی جکڑ میں لیا ہوا ہے۔

"اگر یہ کہا جائے کہ ادب اور تاریخ کی حدیں متحد ہوتی ہیں، یا، ہو جا، سکتی ہیں تو یہ کوئی مصنوعی اَمر، نہیں۔ قرار واقعی، یہی کیفیت اپنی اصل میں موجود ہے۔ بہت سا، ادبی لٹریچر، اپنے وقت کی گواہی دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور اس کا سبب یہی ہے کہ ادب اپنے وقت کو سمیٹ لیتا ہے اور یہ وقت، اُس متعلقہ زمین سے ہوتا ہے، جہاں یہ ادب پیدا ہوتا ہے۔"(3)

سلیم شہزاد کا یہ ناول ایک طرف استحصالی قوت اور دوسری طرف سرائیکی وسیب کے لوگوں کی سوچ، آشکار کر رہا ہے۔ مصنف نے جہاں ایک طرف علامتوں کو برتا ہے تو دوسری طرف قصہ گو، بنکر، سرائیکی خطے کا قصہ بھی سنایا ہے۔ ناول میں سرائیکی وسیب کا نقشہ، اس طرح کھینچا ہے کہ پورا سرائیکی وسیب اپنے مُکھ مہاندرے (روشن چہرے)، کے ساتھ، ہمارے مطالعے میں آجاتا ہے۔

خستہ اور بے حال بستی، جہاں بہت سارے مکان زمیں بوس ہو چکے ہیں اور کئی غیر آباد ہیں، وہاں پانی بھی دستیاب نہیں کہ نلکے کی ہتھی ٹوٹ چکی تھی، مگر یہاں کے انسان دوستوں نے مسافروں کے لئے پانی کی دستیابی کو یقینی بنایا ہوا ہے۔۔

"نلکہ سُکن پاروں، جھگے دے باہروں، کہں پُرانا دِلا، پانی دا، تے، اُوندے نال مٹی دا کٹورا، رکھ چھوڑیا ہا۔ جو لنگھدے ٹپدے پاندھی اُوں دے نال اَپنی تریہہ لہا سگن۔ خبر نئیں کیڑھا تے کڈاں اُون دِلے کوں پانی نال بھر، ویندا ہا۔"(4)

(ترجمہ۔۔راقم)۔۔ نلکے کا پانی خشک ہونے کی وجہ سے، کسی نے پُرانے گھڑے میں پانی ڈال کر، ساتھ ہی پانی پینے کے لئے مٹی کا کٹورا بھی رکھ دیا تھا۔ تاکہ آتے جاتے راہ گیر، اس سے اپنی پیاس بجھا سکیں۔ مگر یہ پتا نہیں، کہ کون اور کب، اسے پانی سے بھر جاتا تھا۔)

سرائیکی وسیب میں توہمات نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ تعلیم آنے سے توہمات کا شکنجہ ڈھیلا تو پڑتا جا رہا ہے، لیکن بڑی عمر کے لوگ ابھی تک، توہمات کے اثرات سے باہر نہیں آئے۔

"حسّو، کی بہو، کیا بیمار ہوئی کہ سارے گھر والوں کی بھوک ہی مر گئی۔ حسّو، اور اس کے گھر والے روزانہ کوئی نہ کوئی جڑی بُوٹی، کوئی دوائی کی پُڑیا لے آتے کہ کسی طرح آفاقہ ہو۔ کوئی اُسے شہر کے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا مشورہ دیتا تو کوئی، سر، سے مرچیں گھمانے اور دَم کرانے کی صلاح دیتا۔ حسّو، کی بہو ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ کہ اُسے ڈاکٹری علاج یا انجکشن سے ڈر لگتا تھا۔ گھر والے اُسے روزانہ عطائی کی دی ہوئی جڑی بُوٹیاں اور پُڑیاں کھلا رہے تھے، مگر اُسے کوئی آفاقہ نہیں ہو رہا تھا۔"(5) (ترجمہ۔راقم)

مگر، جب حسّو کی بہو، شفایاب ہوتی ہے تو، مصنف سلیم شہزاد نے، سرائیکی وسیب میں خوشی

منانے کے منظر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ سرائیکی وسیب کا سارا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔

"حسّو، کی مراد کیا پوری ہوئی، اس کے گھر ڈھول اور شادیانے بند ہونے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ ڈھول والا، گھوم گھوم کر ڈھول بجا رہا تھا اور بستی والے جھمر ڈال رہے تھے۔ وسو (حسّو کا بیٹا)، کے وجود سے خوشی کے قطرے ٹپکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ لوگوں سے جپھیاں ڈال کر مل رہا تھا۔ حسّو کی بیوی اور بہو، ایک دوسرے کا مُنہ چوم رہی تھیں۔ اور آنے والی خواتین کو گلے لگا رہی تھیں۔"(6) (ترجمہ۔۔راقم۔۔)

جب ہم اس ناول کا جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ ناول جدیدیت سے سفر کرتا ہوا، مابعد جدیدیت کے دائرے میں آگیا ہے۔

"جدیدیت کے جلو، میں اجنبیت، ذات پرستی، خوف، تنہائی، یاسیّت اور احساسِ جُرم کی یلغار ہوئی تھی۔۔۔اسی طرح، جدیدیت میں، جس نے اجنبیت، تنہائی، شکستِ ذات کا ذکر کیا، یا، ابہام و علامت ڈال دی، جدید ہو گیا۔"(7)

جب ہم، جدیدیت کے مندرجہ بالا اوصاف دیکھتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ اجنبیت، ذات پرستی، خوف، تنہائی، یاسیّت اور لایعنیت، اس کے خاص موضوعات ہیں۔ اور ابہام و علامات کے ذریعے، لکھاری اپنا مدّعا، بیان کرتا ہے۔ سلیم شہزاد کا یہ ناول، پلوتا، اسی رُجحان سے شروع ہوتا ہے۔ یاسیّت، شکستِ ذات اور لایعنیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔

"بے بس انسان کی زندگی، بے معنی ہوا کرتی ہے۔ کیا بندہ اتنا بے بس بھی ہوتا ہے کہ جو لکھنا چاہے، اُسے لکھ نہ سکے۔ دماغ میں تو باتیں ہوں، مگر اُسے، اپنے قلم پر اختیار نہ ہو۔ وہ جب سے وہاں سے واپس آیا تھا، کچھ لکھ نہ سکا تھا۔ بے بس ہو کر، وہ گھر سے نکلا، مگر اُس کے قدم کبھی آگے پڑتے اور کبھی پیچھے۔ پھر بھی وہ چلتا جا رہا تھا۔ چلتا جا رہا تھا۔"(8)۔
(ترجمہ۔۔راقم۔۔)

یاسیّت کے شکار، انسان کی گفتگو بھی، لایعنی، ہو جایا کرتی ہے۔ سلیم شہزاد، اس ناول میں لکھتے ہیں کہ:

"روایت ہے کہ "پنج ہزاری" درخت کے پتوں سے پسینے کی بوندیں ٹپکا کرتی ہیں۔ سانپ تیز آواز (شکاٹ) سے، اُس کی آنکھ کھلتی ہے۔ ایک سانپ اپنے بل میں داخل ہو رہا ہے اور جمعرات کے دن کی بارش، اب شروع ہو رہی ہے۔"(9) (ترجمہ راقم)

ناول کا واحد متکلم، کبھی بادلوں کو دیکھکر خوف کا شکار ہو جاتا ہے تو کبھی درخت (پنج ہزاری) سے متعلق روایات سن کر۔ یہاں تک کہ اگر اُسے جمائی آجائے تو وہ اُس سے متعلق بھی کئی واہموں کا شکار ہو جاتا

ہے۔اُسے ریت کے ٹیلوں سے بھی خوف آنے لگتا ہے۔

"اُسے ریت کے چھوٹے ٹیلے (ٹبڑی) سے ڈر لگنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چل پڑی۔۔۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کے قدموں کی آواز بھی ٹیلے کو سنائی نہ دے، اور نہ ہی کوئی اُسے دیکھے۔۔۔ جمائی، ایک لکیر کی طرح اُس کے ساتھ چل پڑی۔ بالکل پتلی اور نامعلوم لکیر۔ جس کے ایک طرف اوٹ تھی اور دوسری طرف ٹیلا۔ اُسے وہ ٹیلا اپنے اوپر گرتا ہوا محسوس ہوا۔"(10)۔(ترجمہ ۔۔راقم۔۔)

جدیدیت کے عناصر، خوف، تنہائی اور یاسیّت، کو اپنی جلو میں لیتا ہوا یہ ناول، مابعد جدیدیت کے موضوعات بھی اپنے اندر، سمولیتا ہے۔مابعد جدیدیت کوئی تھیوری یا نظریہ نہیں ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بقول: "مابعد جدیدیت کا تعلق، معاشرے کے مزاج اور کلچر کی صورتِ حال سے ہے۔"(11)مابعد جدیدیت کی وضاحت کرتے ہوئے ایک اور جگہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ:

"مابعد جدیدیت ایک کھلاڈُلا، ذہنی رویہ ہے۔ تخلیقی آزادی کا، اپنے ثقافتی تشخص پر اصرار کرنے کا، معنی کو سکہ بند تعریفوں سے آزاد کرنے کا، دی ہوئی لیک کے جبر کو توڑنے کا، ادعائیت، خواہ سیاسی ہو، یا، ادبی، اِس کو رَد کرنے کا۔ زبان یا متن کے حقیقت کے عکسِ محض ہونے کا نہیں، بلکہ حقیقت کے خِلق کرنے کا۔ معنی کے معمولہ رُخ کے ساتھ، اُس کے دبائے یا، چھپائے ہوئے رُخ کو دیکھنے دکھانے کا اور قرآت کے تفاعل میں، قاری کی کارکردگی کا۔"(12)

اگر اس تعریف کے ساتھ، مابعد جدیدیت کی بابت، دیوندار سر کی رائے بھی دیکھ لی جائے تو، مابعد جدیدیت کے سارے نکات اکٹھے اور واضح ہو جائیں گے۔دیواندار سر کے مطابق:

"مابعد جدیدیت، مابعدالطبیعات، تاریخ کے مروجہ تصورات اور عقلیت کے خلاف ایسی طرزِ فکر ہے، جس سے عہدِ حاضر کی فکر اور تہذیب بہت متاثر ہوئی ہے۔کوئی متعین اور جامد مرکز نہیں۔"(13)

جب ہم مابعد جدیدیت کے اِن نکات کو مدِ نظر رکھ کر، سلیم شہزاد کے ناول، پلوتا، کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُن کے ناول میں ایک کھلاڈُلا ذہنی رویہ ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ناول کا کوئی پلاٹ نہیں۔اُنہوں نے تخلیق کار کی آزادی کا حق استعمال کیا ہے اور اس خطے کے سرائیکی تشخص کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اور اس کوشش میں وہ مکمل طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔

"بستی میں ہر طرف میٹھی روٹی (بُسری) کی خوشبو، پھیلی ہوئی تھی۔ میٹھی روٹی کو تھال میں رکھ کر تقسیم کیا جارہا تھا۔ حسّو اور وَسو، نے دو بڑے تھال اُٹھائے ہوئے تھے اور دربار پر آنے

والے ہر شخص کو میٹھی روٹی پیش کر رہے تھے۔ شام تک یونہی میلا لگا رہا۔ جو، بھی اِدھر سے گزرتا، اُس کے ہاتھ میں میٹھی روٹی ضرور ہوتی۔ جو میٹھی روٹی بچ گئی، وہ اُنہوں نے پرندوں کے لئے رکھ دی۔"(14) ۔ترجمہ۔راقم۔

سلیم شہزاد کا یہ ناول، جہاں ایک طرف مابعد جدیدیت کی تھیوری (ثقافتی تشخص) لئے ہوئے ہے، وہاں اِس میں انحرافی رُجحان واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ناول کے عناصرِ ترکیبی سے انحراف کیا گیا ہے۔ ہمارے ناول نگار کے ہم نام، ایک بھارتی مصنف، سلیم شہزاد، لکھتے ہیں:

"جدیدیت کے انحرافی رُجحان کے سبب ادبی اصناف نے اپنی روایات اور ماضی سے، جب رشتہ منقطع کیا تو نتیجے میں غزل، اینٹی اور آزاد ہو گئی۔ نظم میں موضوع سے زیادہ منتشر خیالی اور بے ہئیتی کو اہمیت دی جانے لگی۔ افسانے نے کہانی کو ترک کیا۔۔۔اور جدید فکشن میں اِسی بکھری ہوئی نسل کے فنکاروں نے اپنے داستانی، تمثیلی، حکایتی اور علامتی افسانوں اور بے زمان و مکاں، بے ماجرا اور بے کردار ناولوں سے ایک بے چہرہ ہجوم کھڑا کر دیا۔'(15)

انحرافیت کا یہ رُجحان اردو میں، بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ سرائیکی میں معروف دانشور سئیں اسماعیل احمدانی کے ناول، چھولیاں، میں شعور کی رو، اور انحرافیت، واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اُردو میں بانو قدسیہ کے ناول، راجہ گِدھ، نے اس رُجحان کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

" کردار نگاری میں، اُس نے کرداروں کو مِنہا کر کے کہانی کا سفر جاری رکھا۔ یہاں خود کہانی میں ایک بے عمل (واحد) متکلم کی یاداشتوں سے ایک شعوری ربط ترتیب دیا گیا ہے۔ جس سے ناول کا مرکزی خیال، ہر کڑی سے فطری طور پر جُڑ گیا ہے۔ اس ناول میں وہ کسی سفر نامہ کی طرح، احوال و کوائف پر تبصرے کرتی بھی ہے، مگر یہی مقامات تو سفر میں، میل کے نشانات ہیں۔ جہاں گزرنے والا راہی، پچھلے سفر کے تجربے میں، اگلے سفر کے لئے کچھ دیر کے لئے Re-live کرتا ہے۔"(16)

اُردو ناول طویل عرصے سے سیاسی شعور سے ہم کنار ہے۔ اُردو ناول اپنے آغاز ہی سے برِصغیر پاک و ہند کی سیاست کو موضوع بناتا چلا آ رہا ہے۔ برِصغیر کی مسلم حکومت، انگریزی راج، تقسیم کے بعد کی ہندوستانی اور پاکستانی حکومتوں کے ہاتھوں، فرد کا سیاسی استحصال، اُردو ناول کا موضوع رہا ہے۔ سیاست کے یہ ابتدائی نقوش 1888ء میں ڈپٹی نزیر احمد کے ناول ابن الوقت، میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ سرشار نے جہاں ایک طرف لکھنؤ کی معاشرت بیان کی ہے وہاں سرشار نے یہاں کی سیاست کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ عبدالحلیم شرر نے، فردوسِ بریں، میں فرقہ باطنیہ کی سیاسی سرگرمیوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ پریم چند

کے ناول گوشہءِ عافیت، کے سیاسی واقعات سے ناول کا پلاٹ، ترتیب پاتا ہے۔

عزیز احمد کے ناول، ایسی بلندی، ایسی پستی، کو حسن عسکری نے، سیاسی شعور، کی وجہ سے اجتماعی ناول قرار دیا ہے۔ عزیز احمد کا یہی سیاسی شعور، ہمیں اُن کے ایک اور ناول، آگ، میں بھی نظر آتا ہے۔ جس میں وہ ہندوستان کی سیاسی تحریکوں کو ناول میں پیش کرتے ہیں۔ قراۃ العین حیدر کے ہاں بھی سیاسی شعور، اپنی پوری آب وتاب سے جلوہ گر ہے۔

> ''قراۃ العین نے برِ صغیر کے تہذیبی سفر کے حوالے سے، انسانی عظمتوں کا کھوج لگایا ہے۔ قدیم دور کے گوتم نیلمبر سے جدید دور کے گوتم نیلمبر تک، یہ سفر برِ صغیر کی ثقافتی، سیاسی اور طبقاتی جدوجہد کا دائرہ مکمل کرتا ہے۔''(17)

یہ سیاسی شعور انتظار حسین کے ناولوں، (بستی،۔۔۔، تذکرہ،۔۔ آگے سمندر ہے۔۔،)، خدیجہ مستور کے ناول (آنگن)۔۔ عبداللہ حسین کے ناولوں (اُداس نسلیں۔۔، نادار لوگ۔۔، باگھ۔۔۔اور، قید، میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ حیات اللہ انصاری کے ناول، لہو کے پھول، رفیہ فصیح کے ناول صدیوں کی زنجیر، سیّد شبیر حسن کے ناول جھوک سیال، اور غلام الثقلین کے ناول میرا گاؤں میں بھی سیاست کی کارستانیاں نظر آتی ہیں۔ شوکت صدیقی نے اپنے ناول۔۔۔ خدا کی بستی۔۔۔ میں پاکستان کی سیاسی صورتحال کو بہت وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اقبال مجید کے ایک ناول،،۔ کسی دن۔۔، کا ایک کردار اپنے مقابل سے کہتا ہے:

> "سیاست میں ہمارا کام یہ تلاش کرنا نہیں ہے کہ سچ کیا ہے۔ ہمارا کام یہ تلاش کرنا ہے کہ وہ سچ کیا ہے جو ہمیں درکار ہے۔

سلیم شہزاد نے بھی سرائیکی ناول کو سیاسی شعور عطا کیا ہے۔ اُنہوں نے سرائیکی وسیب میں آکر آباد ہونے والے آبادکاروں کی سیاسی سوچ کو واضح کیا ہے۔ ناول نگار کے مطابق، آبادکار یہاں کے لوگوں کو شاید حقیر سمجھتے ہیں۔ جبکہ یہاں کا دھرتی زاد، اِن آبادکاروں کو ایک غاصب کے طور پر لے رہا ہے۔

> "اُس نے ہمیشہ یہی سوچا کہ آخر باہر سے یہاں آکر آباد ہونے والوں نے، اِس جگہ کو اپنی جگہ کیوں بنا لیا ہے۔ نہ اُن کی زبان ہم جیسی، نہ اُن کے رواج۔ پھر جگہ ہماری، مگر ملکیت اُن کی۔ اور غلام بھی ہم؟ "تم غلام ہی رہو گے۔ تمہاری سوچ ہی اِتنی ہے۔ اس سے آگے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"""ہم غلام ہوں گے، مگر کسی بھی جنگ میں ہم نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی۔ پھر ہم اپنی جگہ کیوں چھوڑیں۔" بھلا، ماں اور جگہ کوئی چھوڑتا ہے"۔ (ترجمہ۔۔راقم)

سلیم شہزاد کے اس ناول میں معنوی عمق، اپنی پوری تاثیریت سے واضح ہو رہا ہے۔ اُن کی یہی تھیوری، اُنہیں سرائیکی کا ایک ممتاز ناول نگار بنا دیتی ہے۔ اُنہوں نے اس ناول میں یہ خوبصورت تھیوری

پیش کی ہے کہ جب ظالم کا ظُلم حد سے بڑھتا ہے تو مظلوم اُسے بد دعائیں دیتے ہیں۔ جس کے سبب، ظالم، دُنیاوی اختیارات اور مال و متاع کے ہوتے ہوئے بھی، سُکھ سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ جب مظلوم، چُپ کر کے ظلم برداشت کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے تو، دھرتی ماں اُنہیں بھی بد دعا (پلوتا) دیتی ہے اور وہ بھی بے سکون ہو جاتے ہیں امن اور آشتی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ گھر میں نہیں، ڈر، میں رہتے ہیں۔ اُنہیں یوں لگتا ہے کہ جیسے آسمان سے بجلی گرنے والی ہو۔

یہی آج کے سرائیکی وسیب کا منظر نامہ ہے۔ یہی آج کا سرائیکی سیاسی بیانیہ ہے، جسے ناول نگار سلیم شہزاد نے بڑی فنکارانہ خوبصورتی سے بیان کر دیا ہے۔ اور سرائیکی ناول کو جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ذائقوں سے آشنا کر دیا ہے۔

حوالہ جات

1. وزیر آغا، ڈاکٹر۔۔اُردو فکشن۔لاہور، الحمد پبلیکیشنز۔2018ء۔ص۔92-191
2. نعیم مظہر، ڈاکٹر/فوزیہ اسلم، ڈاکٹر۔۔اُردو ناول: تفہیم و تنقید۔اسلام آباد، ادارہ فروغِ قومی زبان۔2012ء۔ص۔295
3. وہاب اشرفی۔مابعد جدیدیت۔۔مضمرات و ممکنات۔اسلام آباد، پُورب اکیڈمی۔2007ء۔ص۔149
4. سلیم شہزاد۔۔پلوتا۔۔ملتان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان۔2017ء۔ص۔21
5. سلیم شہزاد۔۔پلوتا۔۔ملتان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان۔2017ء۔ص۔102
6. سلیم شہزاد۔۔پلوتا۔۔ملتان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان۔2017ء۔ص۔113
7. ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر۔(مرتب) مابعد جدیدیت (اطلاقی جہات)۔ملتان، بیکن بکس۔2015ء۔ص۔68
8. سلیم شہزاد۔۔پلوتا۔۔ملتان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان۔2017ء۔ص۔08
9. سلیم شہزاد۔۔پلوتا۔۔ملتان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان۔2017ء۔ص۔23
10. سلیم شہزاد۔۔پلوتا۔۔ملتان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان۔2017ء۔ص۔46-47
11. گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر۔ ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات۔ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔1993ء۔ ص۔522
12. گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر۔اُردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ۔دہلی، اُردو اکیڈمی۔1982ء۔ص۔72
13. دیوندر اسر۔۔ادب کی آبرو۔دہلی پبلیشرز اینڈ ایڈورٹائزر۔1996ء۔ص۔43
14. سلیم شہزاد۔۔پلوتا۔۔ملتان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان۔2017ء۔ص۔113
15. سلیم شہزاد۔جدید ناول، فکر و فن کا منظر نامہ، مضمون مشمولہ ردو ناول: تفہیم و تنقید۔ اسلام آباد، ادارہ فروغِ قومی زبان۔2012ء۔ص۔185
16. احسان اکبر، ڈاکٹر۔پاکستانی ناول۔۔ہیئت، رُجحان اور امکان۔ مضمون مشمولہ ردو ناول: تفہیم و تنقید۔اسلام آباد، ادارہ فروغِ قومی زبان۔2012ء۔ص۔184